ڈاروِن کا نظریۂ ارتقاء[1]

(۲)

عبد الحمید صدیقی

ایک انسان جب ڈاروِن کے نظریۂ ارتقا کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے تو اس کے ذہن میں فوراً یہ سوال اُبھرتا ہے کہ جب اس میں اس قدر اسقام پائے جاتے ہیں تو وکٹورین عہد کے اہلِ سائنس نے ایسے خام نظریے پر اس قدر تیزی کے ساتھ کیوں لبیک کہا؟ اس کا جواب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ایمان باللہ کے خلاف اس عہد میں جو تعصب پھیلا ہوا تھا، وہی اس کو لبیک کہنے کا سبب ہوا۔ پالی (PALEY) نے مشاہداتِ فطرت سے خدا کی ہستی پر جو استدلال کیا تھا، اور تخلیق کے وجود سے خالق کے وجود پر جو دلائل قائم کیے تھے وہ ایسے قوی تھے کہ دہریوں کے پاس ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ ڈاروِن نے آگے بڑھ کر یہ نظریہ پیش کیا کہ قدرت کے اس کارخانہ میں جو انتظام و انصرام یا جو منصوبہ بندی نظر آتی ہے یہ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہے۔ یہ جواب خواہ کتنا ہی کمزور رہو، مگر چونکہ سائنٹیفک طریقِ استدلال کے ساتھ پیش کیا گیا تھا، اس لیے اہلِ سائنس نے اسے فوراً قبول کر لیا اور اس شد و مد سے اس کا صور پھونکا کہ خدا پرستی کا اعتقاد متزلزل ہو گیا۔ باوجودیکہ بالغ النظر سائنس دان ڈاروِن کے نظریے کو پوری طرح تسلیم نہ کرتے تھے اور اس میں بہت سی خامیاں انہیں نظر آتی تھیں مگر اسی مذہب بیزاری (THE OPHOBIA) نے انہیں مجبور کیا کہ اس خام نظریے ہی کا ڈھول پیٹیں۔ مثال کے طور پر ہکسلے کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ وہ ڈاروِن کے نظریے کو پوری طرح نہیں مانتا تھا، مگر اس کے باوجود اس نے ڈاروِنیت کی زبردست حمایت محض اس بنا پر کی کہ یہ نظریہ ایک خالق کے وجود اور اس کی تخلیق کے غیر مرغوب اعتقاد کی مخالفت کے لیے ایک اچھا آلۂ کار بن سکتا ہے۔

---

[1] اس مضمون کی پہلی قسط ترجمان القرآن جلد ۵۰ عدد ۶ میں شائع ہو چکی ہے۔

اس حقیقت کا اعتراف خود اس نظریے کے بڑے بڑے حامیوں تک نے کیا ہے۔ اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے وائس مین (WEISSMANN) لکھتا ہے:

"کائنات کی تعبیر کے لیے ہم انتخابِ طبیعی کے اصول کو اس بنا پر مانتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی اصول ایسا نہیں جو اس کارخانۂ قدرت کی خالق کے اقرار کے بغیر کوئی دل لگتی تشریح کر سکے۔"

دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ایک ایسا استدلال جو کسی طرح قابلِ اعتماد نہیں ہے صرف اس لیے قبول کر لینا چاہیے کہ اگر ہم اس کو قبول نہ کریں تو ہمیں خدا کی ہستی اور اس کی صانعیت و ربوبیت ماننی پڑے گی۔

اسی طرح پروفیسر ڈی لیج (DELAGE) جو پیرس یونیورسٹی میں علم نباتات کا معلم ہے ڈارون کے نظریئے پر بشدت نکتہ چینی کرتا ہے اور اُسے رد کر دیتا ہے مگر آخر میں لکھتا ہے:

"ڈارون کی شہرتِ دوام کی اصل اور حقیقی وجہ صرف یہ ہے کہ اس نے ذی روح اشیاء کے جسمانی تغیر و تبدل کے ہوش ربا عمل کو کسی مافوق الطبیعی ذات کی کرشمہ سازی کی بجائے خارجی عوامل کا نتیجہ ثابت کیا ہے۔"

وقوع بلا علت (SPONTANEOS GENERATION) کا نظریہ جو ڈارون کے فکر کی جان ہے، مشاہدہ سے ثابت نہیں کیا جا سکتا اور اس امر کے اثبات پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکی کہ بے جان مادے سے زندگی خود بخود اُبھر آتی ہے لیکن خدا سے بیزار مادہ پرست اس کو بے دلیل مانتے چلے جاتے ہیں۔ وائس مین مغرب کی اس ہٹ دھرمی کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:

"وقوع بلا علت کو اگرچہ کوئی کوشش صحیح اور برحق تو ثابت نہیں کر سکی لیکن ہم اسے ایک منطقی ضرورت کے طور پر ماننے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔"

آخر سوچیے کہ یہ "منطقی ضرورت" کس قدر غیر منطقی ہے۔ منطق کا ہرگز یہ مقتضی نہیں کہ ہم تمام دلائل و شواہد سے قطع نظر کر کے ایک نتیجے کو صرف اس لیے مان لیں کہ ہم ایک خیالی مقدمے سے

خواہ مخواہ محبت رکھتے ہیں۔ اور ہم نے اس مقدمے کو بغیر کسی معقول وجہ اور ثبوت کے صحیح فرض کر لیا ہے منطق کا اقتضا تو یہ ہے کہ ہم کسی ایسے نتیجے کو تسلیم نہ کریں جس کے مقدمات ثابت شدہ نہ ہوں، اور جس کے مقدمات کی صحت کا پوری طرح اطمینان نہ کر لیا گیا ہو۔ واٹسن اور اس کی سی ذہنیت رکھنے والوں نے پہلے یہ مقدمہ فرض کر لیا ہے کہ خدا نہیں ہے مگر دوسری طرف اپنے سامنے جب ایک عالم کو موجود پایا تو ان دونوں مقدمات کی ترتیب سے یہ نتیجہ خواہ مخواہ اخذ کر لیا کہ عالم خود بخود پیدا ہوا ہے۔ درآں حالیکہ "خدا نہیں ہے" کا کوئی ثبوت نہیں ہے، اور یہ مقدمہ خود محتاجِ دلیل ہے مگر یہ لوگ مصر ہیں کہ نتیجہ کو ضرور مان لیا جائے۔ ان لوگوں کی عقل پر ایسا پردہ پڑا ہوا ہے کہ یہ عالم کو ایک صانع حکیم کی تخلیق کا نتیجہ ماننے کے لیے تو تیار نہیں ہوتے مگر یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں کہ یہ عالم ایک بے جان، بے روح، بے عقل مادے کے محض امتزاجی عمل کا نتیجہ ہے اور کسی مقصد و غایت کے بغیر خواہ مخواہ چل رہا ہے۔

اس نظریہ کو جن اسباب کی بنا پر ایک زبردست شہرت حاصل ہوئی اُن میں بہت کچھ دخل پادریوں کے غیر دانشمندانہ رویہ کا بھی ہے۔ انہوں نے مذہب کو اس انداز سے پیش کیا کہ لوگوں کے اندر مذہب سے نفرت، اور ایک ایسے عقیدہ کے لیے ایک جذباتی لگن پیدا ہو گئی جو مذہب اور اس کے معتقدات سے انحراف کے لیے انسانی ذہن کو تیار کرے۔ انگلستان کا مشہور طنز نگار برنارڈ شا اس نظریہ کی غیر معمولی مقبولیت کے وجوہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ہمیں اس بات کا پوری طرح احساس ہونا چاہیے کہ جب اس نظریہ کا غلغلہ بلند ہوا تو یورپ میں کس قسم کے مذہبی اعتقادات پائے جاتے تھے۔ خدا کے بارے میں ایک عام تصور یہ تھا کہ وہ ایک خوفناک قسم کا مطلق العنان بادشاہ ہے جس کی سیرت کا خمیر حسد، بغض اور کینہ کے عناصر سے اٹھایا گیا ہے۔ اُسے انسانیت کو دکھ پہنچانے میں گوناگوں لذت محسوس ہوتی ہے۔ اس تصور کی موجودگی میں اہلِ کلیسا جسمانی تکلیف کے رفع کرنے کی مختلف تدابیر کو خداوند تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ میں دخل اندازی سمجھتے تھے۔ جب خالق

کائنات کے متعلق کسی سوسائٹی میں اس قسم کے باطل اور گمراہ کُن نظریات موجود ہوں تو پھر اس سوسائٹی کا ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو قبول کر لینا کوئی ایسی بات نہیں جو انسانی سمجھ میں نہ آسکے۔"

یہ سب حقائق اس بات پر شاہد ہیں کہ یورپ میں کچھ دلائل اور شواہد ایسے نہ تھے جنہوں نے خدا سے بیزار مادہ پرستوں کو خدا کے انکار اور نظام عالم کی میکانکی توجیہ پر آمادہ کیا، بلکہ وہ محض جذبات تھے جو کسی نہ کسی وجہ سے خدا پرستی کے خلاف بھڑک اٹھے تھے اور انہوں نے محض اس وجہ سے عالم کو خدا سے بے نیاز فرض کیا کہ وہ ایسا کرنا چاہتے تھے۔[۱]

---

[۱] تعصب اور ضد کے زیر اثر آکر جذبات کا بہک جانا کوئی ایسی چیز نہیں جس کی مثالیں تاریخ انسانی میں نہ ملتی ہوں۔ انفرادی زندگی میں تو ہم قدم قدم پر اس سے دوچار ہوتے ہیں اور جب اجتماعی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں ایسی مثالوں کی کمی نہیں پاتے۔ دُور نہ جائیے اور دیکھیے کہ کیا اشتراکیت کو دولتمند اور سرمایہ دار طبقات کے خلاف اندھے غیظ و غضب نے جنم نہیں دیا جس طرح مذہبی طبقوں کے خلاف نفرت کا نتیجہ مادہ پرستی اور ڈارونیت کی شکل میں رونما ہوا اسی طرح سرمایہ دار طبقوں کی ریشہ دوانیوں کے خلاف ردِّعمل کے طور پر کمیونزم معرض وجود میں آیا۔ عقلیت دونوں جگہ نہ تھی۔ پھر چونکہ مذہبیت اور سرمایہ داری نظام دونوں کے علمبردار یورپ میں باہم متحد تھے، بلکہ دونوں کا ایک ہی طبقہ تھا، اس لیے کمیونزم اور لامذہبی دونوں باہم متحد ہو گئے اور اس اتحاد کا کلی ظہور روس میں ہوا، جہاں عہد زار کے نظام اجتماعی کے نقش کہن کو مٹانے کے لیے مذہب کو بھی تیاگ دینا لازمی اور ضروری سمجھا گیا۔ روس کی لادینی جن جذبات کے تحت ظہور پذیر ہوئی ان کو بخارین نے نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے:

"باگ (BOG) یعنی خدا کا لفظ اُسی مادہ سے مشتق ہے جس سے کہ لفظ امیر نکلا ہے۔ اس لیے خدا، قوت، طاقت اور امارت کا ہم معنی ہے۔ ذات باری کا دوسرا نام لارڈ ہے یہ لفظ غلام کی ضد ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بعض لوگ حاکم سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ یہ سارے الفاظ ایک ہی ذہنیت کے آئینہ دار ہیں۔ خدا پر یقین چند نفرت انگیز حسی اور مادی صفات کا[۲]

مادہ پرست بڑے طمطراق سے کہتے ہیں کہ ہم کسی بات کو بغیر کافی شہادت اور مضبوط دلائل کے نہیں مان سکتے۔ چنانچہ ہکسلے بڑے فخر کے ساتھ یہ لکھتا ہے:

"ہمارے نزدیک ہر وہ دعویٰ جس کی پشت پر شواہد نہ ہوں نہ صرف باطل ہے بلکہ ایک عظیم جرم بھی ہے۔"

مگر اس قسم کے معیار صرف دین اور دینی عقائد کو پرکھنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ رہی مادیت تو اس کو قبول کرنے کے لیے یہ عقلیت مآب نہ تو کسی شہادت کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ ہی کسی دلیل کے طلبگار ہوتے ہیں۔

سائنس کے علمبردار اہلِ مذہب پر جو سب سے بڑا الزام لگا سکتے ہیں وہ تعصب، تنگ نظری اور ہٹ دھرمی کا ہے۔ لیکن تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اصل سائنس بھی اس الزام سے بری نہیں۔ اگر کوئی شخص اہلِ سائنس کے معتقدات کے خلاف اعتقاد رکھتا اور سائنس کے مسلمہ نظریات کو نہ مانتا ہو، یا علانیہ روحانیت کا قائل ہو تو آج بھی کسی سائنٹفک فیلوشپ کا کامیاب امیدوار نہیں ہو سکتا۔

پھر اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ شہادت کی قدر و قیمت جانچنے میں انسان کے تعصب کا اعتبار کیا جا سکتا ہے مگر دلائل کی قوت یا کمزوری کے معاملے میں تعصب و عدمِ تعصب کا لحاظ کرنا درست نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ارواح پر اعتقاد رکھتا ہے تو جن بھوت کے متعلق اس کی شہادت کو جانچنے میں ہم اس کے تعصب کا ضرور لحاظ کریں گے کیونکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی نظر پر اس کے اعتقادِ ارواح کا تسلط ہے لیکن کسی شخص کے دلائل کے مقابلے میں یہ استدلال کرنا کہ وہ متعصب ہے ایک احمقانہ بات ہے۔

ص۔ اظہار ہے۔ یہ نہ صرف اس دنیا میں غلامی بلکہ ساری کائنات میں غلامی کے اقرار کا دوسرا نام ہے۔"

ان الفاظ سے اس امر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خدا کے انکار کے لیے کس قسم کے بھونڈے دلائل لائے جا رہے ہیں۔

دنیا کا ہر وہ شخص جو اپنا کچھ نظریہ یا اعتقاد رکھتا ہے کسی حد تک متعصب ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو مذہبی اور لامذہبی دونوں طریقوں کے پیرو اپنے مخصوص طریقے کے حق میں متعصب ہیں لیکن لادین اہلِ سائنس ہمیشہ تعصب کا بہانہ بنا کر اہلِ دین کی تنقیدوں کو رد کر دیتے ہیں حالانکہ اہلِ مذہب کے دلائل کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ مشہور سائنس دان میوارٹ (MIVART) نے ڈارون کے نظریے کے پرخچے اڑا دیئے اور اس قدر مدلل تنقید کی جس کا جواب کسی ڈارونی سے بن نہ آیا مگر اس کے نقد کو صرف اس لیے ناقابلِ اعتنا سمجھا گیا کہ وہ ایک ایسے گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو دنیائے سائنس سے خارج تھا۔

اگر محض کسی شخص کے اندر تعصب ثابت کر دینے پر اُس کے خیالات کو رد کر دینا صحیح اور جائز ہو تو پھر مذہب پر کیسے اور اُسی کے ہم خیال لوگوں کے اعتراضات کو بھی ناقابلِ توجہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہ سب حضرات تعصب میں گرفتار تھے۔ معاملہ پھر اسی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ہر وکیل اور بیرسٹر کے دلائل کو صرف اس بنا پر ٹھکرایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے موکل کے حق میں تعصب رکھتا ہے۔ دنیا کا کونسا ایسا فرد ہے جو تعصب کی ہر آلائش سے پاک اور منزہ ہو۔ ایک مضبوط دلیل بہرحال مضبوط ہے خواہ متعصب کی طرف سے پیش کی جائے یا غیر متعصب کی طرف سے۔ ایک مرتبہ انگلستان کے ایک جج نے ایک بیرسٹر کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"تمہارے دلائل محض اس بنا پر کمزور نہیں ہو سکتے کہ تم اپنے موکل کو قصوروار سمجھتے ہو یا وہ اس وجہ سے مضبوط نہیں ٹھہرائے جا سکتے کہ تم اُسے معصوم خیال کرتے ہو۔"

تعصب کے اس عام الزام کے علاوہ ڈارون کے حامی بسا اوقات مخالف کے دلائل کا محض یہ کہہ کر استخفاف کرتے ہیں کہ یہ شخص اناڑی (AMATEUR) ہے یا اس نے کبھی کوئی سائنٹفک تربیت نہیں پائی۔ یہاں پھر وہی غلطی کی جاتی ہے۔ ایک مصنف اگر کسی مسئلے میں اپنی شہادت یا رائے پیش کرے تو آپ سوال کر سکتے ہیں کہ وہ کس قابلیت کا آدمی ہے مگر جب وہ اپنے دلائل پیش کرے یا اعتراض کرے تو آپ کو اس کی حجت سے بحث کرنی چاہیے نہ کہ اس کی قابلیت سے۔

ڈارون کے پرستاروں نے اپنے مخالفین کے اعتراضات کو بے وزن ثابت کرنے کے لیے اسی قسم کی چالاکی اور عیاری سے کام لیا۔ یہاں اس موضوع پر کسی تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں۔ لیکن سیموئل بٹلر کے معاملے میں ان حضرات نے جو متعصبانہ روش اختیار کی وہ اس بات کی زندہ شہادت ہے۔ ہر وہ شخص جس نے ڈارون پر سیموئل بٹلر کی تنقید کو پڑھا ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ اُس کا جائزہ بڑا ہی فاضلانہ تھا۔ خود اہل سائنس میں سے بھی کئی ایک نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر جے۔ اے ٹامسن نے اس کے نقد کو نہایت عالمانہ قرار دیا ہے۔

اس کے علاوہ بٹلر نے نظریہ یادداشت پیش کر کے یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ گو اُس نے سائنس کی باقاعدہ تعلیم نہیں پائی مگر وہ سائنٹفک دماغ رکھتا ہے اور سائنٹفک انداز سے سوچ سکتا ہے اور اس باب میں کسی پیشہ ور سائنس دان سے کم نہیں ہے۔ اُس کی کتاب "زندگی اور عادت" جو ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی ایک نہایت آبدار و مرصع کتاب تھی جو ایک سائنٹفک مسئلے پر ریسرچ کر کے ایک عامی نے لکھی تھی۔ اس کتاب میں بٹلر نے ثابت کیا ہے کہ جس چیز کو ہم جبلت کہتے ہیں وہ دراصل حافظے کا رسوخ ہے۔ اس کتاب کو علمی حلقوں میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لیکن بٹلر کی ساری قابلیت اور ذہانت کے باوجود ڈارون پر اس شخص کی تنقید کو ناقابلِ اعتنا قرار دیا گیا۔ بلکہ دنیائے سائنس نے بٹلر کا بالکل مقاطعہ کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس دانوں نے ایک جتھہ بنا رکھا ہے اور وہ سائنس کے اجارہ دار بن کر کوشش کرتے ہیں کہ اپنی ٹولی کی حدود میں باہر کے کسی آدمی کو دخل نہ ہونے دیں۔

سائنس دانوں کی اس تنگ نظری اور تعصب کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بٹلر کے نظریۂ حفظ کا سارا کریڈٹ ہیرنگ کو دے دیا اور بٹلر کا نام تک نہ لیا حالانکہ اس نظریہ کے ساتھ اس "اناڑی سائنس دان" کا بالکل وہی تعلق ہے جو نظریۂ انتخاب طبیعی کے ساتھ ڈارون کا ہے۔ اس سوقیانہ سلوک کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہیرنگ اُن کے اپنے گروہ کا آدمی تھا اور بٹلر ان کی پارٹی کا مخالف۔

اس تعصب کی مثالیں ہمیں خود ڈارون کی تحریروں میں بھی بکثرت ملتی ہیں۔اُس نے اپنی تحریروں میں اپنے پیشروؤں کے علمی کارناموں کا بہت کم اعتراف کیا ہے۔اُس کی کتاب اصل الانواع میں لامارک کی طرف صرف ایک سرسری سا اشارہ ملتا ہے۔ڈارون کے بعض حامی اُس کی اس روش کے لیے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اُسے اپنے پیش روؤں کے کارناموں کا علم نہ تھا لیکن یہ عذر ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔خود ڈارون نے اعتراف کیا ہے کہ اس نے سرچارلس لائل کی کتاب (PRINCIPLES OF GEOLOGY) سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ لائل نے اس کتاب میں ایک پورا باب لامارک کے متعلق لکھا ہے اور اس کے مقالہ "اصول تحوّل" کو خود اس کی اپنی عبارت میں نقل کیا ہے۔

لائل کے اس فعل پر ڈارون صاحب بہت بھنّائے اور انہوں نے یہ دیکھ کر کہ لائل نے ڈارونیت کو لامارک کے نظریے کی محض ایک جزئی تبدیل و تعدیل (MODIFICATION) قرار دیا تھا، اُس سے مراسلت کی اور لکھا کہ "لامارک کی کتاب ایک لغو کتاب ہے جس سے میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا"۔

اور تو اور ڈارون نے خود اپنے دادا کے کارناموں پر بھی پانی پھیرا اور اس کا بھی اعتراف نہ کیا حتیٰ کہ وہ اتنا بھی ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ اس سے پہلے کچھ لوگ نظریۂ ارتقا کے لیے رستہ صاف کر گئے تھے۔آخر کار جب اس کی چوری پکڑی گئی تو پھر مجبوراً اُس نے بفون اور اراسمس ڈارون کا اعتراف کیا اور لامارک کے متعلق چند تحقیر آمیز فقرے لکھے اور یہ اس وقت ہُوا جب "اصل الانواع" کے چھ ہزار نسخے فروخت ہو چکے ہیں۔

ڈی لیج ڈارون کے اس طرزِ عمل پر بڑی حیرانی کے ساتھ لکھتا ہے:

"ہم حیران ہیں کہ آخر ڈارون نے لامارک کے نظریہ تحوّل کا جو دراصل اُس کے نظریۂ ارتقا کی بنیاد ہے، کیوں اعتراف نہیں کیا"۔

اس کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ ڈارون اور اس کے ہم خیال ساتھیوں میں حسد کی آگ بھڑک

رہی تھی۔ وہ کسی ایسی چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ جن سے کسی دوسرے شخص کی قابلیت یا ذہنی برتری ظاہر ہو سکے۔ وہ اس بات کے دعویدار تھے کہ کائنات کی جو میکانکی تشریح انہوں نے کی ہے وہ محض انہیں کی دماغی کاوش کا ثمرہ ہے اس لیے کسی دوسرے فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس پر لب کشائی کرے۔ اگر کوئی شخص اس نظریہ کا سو فیصدی حامی ہوتا تو وہ عالم اور فاضل تسلیم کیا جاتا لیکن اس کے برعکس اگر کوئی دوسرا علم وفضل کے باوجود کائنات کی اس مادی تعبیر سے اختلاف کرتا تو اُسے جاہل اور ناتربیت یافتہ کہکر یکسر نظر انداز کر دیا جاتا۔ تعصب، تنگ نظری کی اس سے زیادہ افسوسناک صورت اور کیا ہو سکتی ہے۔

یہ تو ہے وہ ذہنی ساخت جس کے ساتھ نظریۂ ارتقا پروان چڑھا۔ اب ذرا ایک نظر اُس طریقِ کار پر بھی ڈال لیں جس کے ذریعہ اس کی تکمیل ہوئی۔

ارتقا کے پورے لٹریچر کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ سارا لٹریچر ایسے دعووں سے بھرا پڑا ہے جو شہادت کی حدود سے آگے نکل گئے ہیں۔ عملی مفروضات کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے گویا کہ وہ ثابت شدہ حقائق ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے گویا کہ قانونِ ارتقاء جیسی کوئی چیز حقیقتہً دنیا میں موجود ہے درآنحالیکہ اس نظریہ کے ثبوت میں کوئی براہ راست شہادت ہمیں نہیں ملتی ہے۔ جن واقعات اور شہادت سے ارتقا کا استدلال کیا جاتا ہے اُن کی دوسری توجیہیں بھی کی جا سکتی ہیں اور ان توجیہوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کا انحصار ہمارے اس میلان پر منحصر ہے جو فطری طور پر ہم الٰہیت یا دہریت کی جانب رکھتے ہیں۔ نظریۂ ارتقا کو جس طریق سے ثابت کیا جاتا ہے وہ عملاً یہ ہے کہ چند ہڈیوں کے مل جانے سے تخیلات کی ایک پوری عمارت کھڑی کر لی جاتی ہے، قیاس ہی قیاس سے ان ہڈیوں کو جوڑ کر ایک ڈھانچہ بنایا جاتا ہے، پھر اس پر گوشت پوست چڑھایا جاتا ہے اور اس کے بعد اس کو ایک خاص شکل کا جانور بنا کے ایک نام رکھا جاتا ہے، پھر قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ فلاں فلاں جانور کی نسل سے ہوگا۔ غرض وہم ہی وہم سے اس کا پورا شجرۂ نسب تیار ہوتا ہے اور ہر پُشت کے لیے ایک نام تجویز کر لیا جاتا

ہے۔ لوگ ان ناموں کو پڑھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ فی الواقع اس پورے معجزے کا ثبوت طبقات الارض میں مل چکا ہے اور ان ناموں کے جانور حقیقت میں موجود تھے۔ حالانکہ ان کا وجود صرف ارتقائی سائنس دانوں کے تخیل میں ہے اور خارج میں ان کا کوئی نشان موجود نہیں ہے۔

مثال کے طور پر چند سال ہوئے جاوا میں ایک کا رنرا اور چند ہڈیاں ملیں جن کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا کہ یہ بندر کے مورث اعلیٰ کی ہڈیاں ہیں۔ پھر اس کو ایک نام دیکر اس کا پورا ڈھانچا تخیل میں بنا کے اور گوشت پوست چڑھا کے اتنی باریکی کے ساتھ اس کی صورت گری کی گئی کہ بال اور خد و خال بلکہ عادات و خصائل تک متعین کر لیے گئے۔ اس کا نام اسی طرح رکھ لیا گیا گویا کہ وہ ایک تاریخی شخصیت ہے حتیٰ کہ اس کی تصویریں تک علمی رسالوں میں چھپ گئیں جن میں وہ اچھا خاصا ایک مکمل اور زندہ جانور نظر آتا ہے۔ ایک ناواقف اس تصویر کو دیکھ کر یہ گمان نہیں کر سکتا کہ اس پوری تصویر میں صرف ایک ران کی ہڈی چند دانت اور ایک حصہ کاسہ سر تو حقیقی ہیں اور باقی سب تخیل کی پرکاری۔

جس جانور کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کی تو پھر بھی ہڈیاں موجود تھیں لیکن ارتقائی سائنس دانوں کی ضرورت نے بعض ایسے جانوروں کی صورت گری کی جن کا اتنا وجود بھی نہ تھا۔ مثلاً جب یہ نظریہ کہ پرندے رینگنے والے جانور کی ارتقائی صورت ہیں، "آرکیو پٹیرکس" سے ثابت نہ ہو سکا کیونکہ اس کے اچھے خاصے پر موجود ہیں تو پھر یہ فرض کر لیا گیا کہ ایک قسم کا رینگنے والا جانور ایک درخت میں رہتا تھا، اُس نے ایک ڈالی سے دوسری ڈالی پر اچکنا شروع کیا اور یہ اچکنے کی عادت اس قدر بڑھی کہ اس کے اثر سے رفتہ رفتہ اس کے پر نکلنے لگے۔ یہ سب کچھ واہمہ اور قیاس تھا مگر ارتقائی سائنس دان اس تصور میں ایسے محو ہوئے کہ اُن کے سامنے فی الواقع ایک ایسا جانور نمودار ہو گیا کہ انہوں نے اسے ایک حقیقی وجود سمجھ کر اس کا نام پراویس (PROAVES) رکھ لیا۔

یہ حضرات سوچنے کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں کہ نظریہ کا اثبات اس پر موقوف ہے کہ فلاں فلاں گم شدہ کڑیاں دستیاب ہو جائیں۔ پھر اپنے نظریے کو ثابت کرنے کی بے چینی انہیں غور

کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ ان گم شدہ کڑیوں کی کیا کیا شکلیں ہونی چاہییں۔ پھر وہ فرض کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ ایسا ایسا ہُوا ہوگا، اس کے بعد جب تخیل زیادہ جم جاتا ہے تو وہ ان کو حقیقت نظر آنے لگتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ فی الواقع ایسا ایسا ہے۔ مثال کے طور پر مسٹر ہکیرافٹ جو زندہ جانوروں پر ایک نہایت قابلِ اعتماد سند ہیں بیان کرنا شروع کرتے ہیں کہ ہرِوا یوِیس کے پر کس طرح نکلے اور اس کی ترتیب اور تدریجی ترقی اس تفصیل کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ سمجھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے کہ مسٹر ہکیرافٹ دراصل ایک بالکل خیالی وجود کی نقش آرائی کر رہے ہیں جس کی ہڈیاں تو درکنار، جس کا ایک بال تک بھی ارضیاتی روداد میں دستیاب نہیں ہُوا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں ہرِوا یوِیس کی جو تصویر درج کی ہے اس پر یہ نہیں لکھا کہ "ایک فرضی جانور کی خیالی تصویر" بلکہ یہ لکھا ہے " ONE OF THE PROAVES " گویا یہ صاحب جن کا مرقع یہاں دکھایا جارہا ہے کسی زرخیز دماغ کی تخیل کاری کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے اور کسی چڑیا گھر میں اب بھی اُن کی زیارت کی جاسکتی ہے یا کسی عجائب خانے میں کم از کم ان کے ڈھانچہ سے تعارف ہوسکتا ہے۔

ایک اور سائنس نواز مسٹر ہیکل (HECKEL) نے انسان کا خیالی نسب نامہ تیار کیا ہے جس میں بندر اور انسان کے درمیان قریب قریب دو درجن کڑیاں گنا دی ہیں جن سے ہر کڑی ایک ثقیل لاطینی نام سے موسوم ہے۔ سائنس دانوں پر ایمان بالغیب رکھنے والا غیر سائنس داں "بندۂ مومن" اس نسب نامے کو دیکھ کر سمجھے گا کہ ان میں سے ہر کڑی زندہ یا حجری صورت میں مل چکی ہوگی تبھی تو اس کی تفصیلی صورت اور اس کا نام تک ایک سائنس داں نے بیان کر دیا ہے۔ اس بیچارے کو کیا خبر کہ یہ سب محض ایک سائنس داں نے بیان کر دیا ہے۔ اس بیچارے کو کیا خبر کہ یہ سب محض ایک سائنس داں کی افسانہ طرازی ہے۔ ان کڑیوں میں سے ایک نے بھی طبقاتِ زمین میں کوئی نشان نہیں چھوڑا ہے اور اس لیے ان آبائے اوّلین کا کوئی وجود ہیکل صاحب کے تخیل سے باہر نہیں ہے۔ ارتقائی لٹریچر میں اس قسم کے شجرہ ہائے نسب بکثرت ملتے ہیں مگر

قریب قریب سب کا حال ہیکل صاحب کے نسب نامے کا سا ہے۔ یہ اُن لوگوں کا حال ہے جو اہلِ مذہب کو خدا اور فرشتوں اور جن اور وحی و الہام و بہشت و دوزخ کے مفروضات پیش کرنے پر اوہام پرستی کا طعنہ دیتے ہیں اور جن کا ادعا یہ ہے کہ آدمی جو بات بھی زبان سے نکالے اُس کا زندہ ثبوت اور شہادت پیش کرے اور اگر اُس نے کوئی بات شہادت کی حدود سے ایک انچ بھی متجاوز بیان کی تو بقول ہکسلے وہ نہ صرف غلط گو ہوگا بلکہ مجرم بھی ہوگا۔

پھر یہ حضرات عام لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ نظریۂ ارتقا میں انسان اور حیوان کے درمیان صرف ایک ہی کڑی مفقود ہے حالانکہ درحقیقت اس زنجیر میں مسلسل دو موجود کڑیوں کے درمیان ایک کڑی ناپید ہوتی ہے اور جس کڑی کو مفقود کہا جاتا ہے وہ دراصل مفروضہ کڑی ہے کیونکہ اس میں صرف یہ قیاس کر لیا گیا ہے کہ ایسی ایک کڑی موجود ہوگی مگر وہ کھوئی گئی۔ ایسی کوئی شہادت آج تک دستیاب نہیں ہوئی جس سے یہ گمان کرنے کی معقول وجہ ہو کہ ایسی کوئی کڑی درحقیقت موجود تھی۔ یہ لوگ مفروضہ کڑیوں کو مفقود کڑیاں قرار دے کر اس فقدان کو ارضیاتی روداد کا نقص قرار دیتے ہیں مگر یہ محسوس نہیں کرتے کہ ایسی مفروضہ کڑیوں کا نہ پایا جانا ارضیاتی روداد کے نقص سے زیادہ خود ان کے اپنے استدلال کی کمزوری پر دلالت کرتا ہے۔

اس کے علاوہ اس حقیقت کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کے ادنیٰ ترین درجے اور حیوانات کے بلند ترین درجے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قدیم ترین انسان کے بارے میں بھی جو کچھ ہم جانتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان روئے زمین پر اپنے نمود کی ابتدا ہی سے بلند ترین حیوانات پر ناقابلِ پیمائش تفوق رکھتا ہے۔ ڈارون اور اس کے حامی ہڈیوں اور ڈھانچوں کی مدد سے انسان اور حیوان کے درمیان ایک ارتقائی تعلق قائم کرنے میں بالفرض اگر کامیاب بھی ہو جائیں تو ان دونوں کے درمیان جو نفسی فرق ہے وہ اتنا عظیم ہے کہ سائنس دانوں کی کوئی "شاعرانہ کوشش" بھی ان کڑیوں کو ملانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اصل میں کڑی ایک ہی ہے جسے ان نادانوں نے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا ہے اور وہ کڑی ایک صانع حکیم کی صنعت ہے اس کو کھو کر یہ لوگ اندھوں کی طرح بالکل تاریکی میں صدیوں سے ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔